’’شرک فی الحقوق‘‘ یا ’’شرک فی العبادت‘‘

ویسے تو اگر ہم اللہ تعالیٰ کے حقوق کو شمار کرنے لگ جائیں تو وہ بے شمار ہو جائیں گے‘ لیکن ’’ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں‘‘ کے مصداق اللہ تعالیٰ کا ایک حق ایسا ہے کہ جس میں اُس کے سارے حقوق آ جاتے ہیں‘ اور وہ حق ہے ’’عبادت‘‘۔ چنانچہ ’’شرک فی الحقوق‘‘ مساوی ہو جائے گا ’’شرک فی العبادت‘‘ کے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون بے شمار مرتبہ آیا ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت اسی حوالے سے ہے کہ ’’اللہ کی عبادت کرو‘ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو‘‘۔ سورۂ ھود کی ابتدائی آیات میں بتایا گیا کہ قرآن مجید کا مقصدِ نزول اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی غرض و غایت کیا ہے۔ فرمایا:

﴿الٓرٰ قف کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ ۙ﴿۱﴾ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ ط اِنَّنِیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ ۙ﴿۲﴾﴾

’’ا‘ل‘ر۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات پختہ کی گئیں‘ پھر وہ کھولی گئیں (ان کی تفسیر کی گئی) اُس ہستی کی طرف سے جو کمالِ حکمت والی ہے‘ تمام چیزوں سے باخبر ہے۔ (اور یہ اس لیے نازل ہوئی) کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی۔ یقیناً میں تمہارے لیے اللہ کی طرف سے خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں‘‘۔

یعنی جو اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور ’’توحید فی العبادت‘‘ کے معیار پر پورے اتر جائیں اُن کے لیے میں بشارت دینے والا ہوں کہ ان کے لیے نعمتوں والی جنتیں ہیں۔ اور جو اس معیار پر پورے نہ اتریں ان کے لیے میں خبردار کرنے والا ہوں کہ ان کے لیے ان کے ربّ کے پاس بڑا دردناک عذاب ہے۔

سورۃ الکہف کی آخری آیت میں نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا:

﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾﴾

’’(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا‘ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے۔ پس جو کوئی اپنے ربّ کی ملاقات کا امیدوار ہو اُسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے‘‘۔

’’عبادت‘‘ کا مفہوم اور اس کے اجزاء

’’شرک فی الحقوق‘‘ یا بالفاظِ دیگر ’’شرک فی العبادت‘‘ کو سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے لفظ ’’عبادت‘‘ کو سمجھنا ہوگا۔ عربی میں ’’عبد‘‘ غلام اور بندے کو اور ’’عبادت‘‘ غلامی اور بندگی کو کہتے ہیں۔ قرآن مجید کی مشہور آیۂ مبارکہ ہے: ﴿وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت) اس کی صحیح ترین ترجمانی کی ہے شیخ سعدیؒ نے کہ: ؎

زندگی	آمد	برائے	بندگی
زندگی	بے	بندگی	شرمندگی!

یہ تو ہوا لفظ ’’عبادت‘‘ کا معنی و مفہوم۔ اصطلاح میں ’’عبادت‘‘ اصل میں کیا ہے‘ امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ نے اِس کی صحیح ترین اور جامع ترین تعبیر کی ہے‘ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے‘ کہ: ’’اَلۡعِبَادَۃُ تَجۡمَعُ اَصۡلَیۡنِ‘‘ کہ عبادت دو بنیادوں یا دو جڑوں کو اپنے اندر جمع کرتی ہے‘ یعنی اس کے دو بنیادی اجزاء ہیں جن کے ملنے سے یہ عبادت وجود میں آتی ہے۔ اور وہ ہیں: ’’غَایَۃَ الۡحُبِّ مَعَ غَایَۃِ الذُّلِّ وَالۡخُضُوۡعِ‘‘ کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتہا درجے کی محبت ہو اور اُس کے ساتھ جمع ہو جائے انتہائی درجے کی عاجزی و انکساری کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بچھ جائے‘ اپنے آپ کو اُس کے سامنے پست کر دے۔ اللہ کی مرضی اور پسند کے مقابلے میں اس کی اپنی کوئی مرضی اور پسند باقی نہ رہے۔ جو اللہ کو پسند ہو وہی اس بندے کو پسند ہو اور جو اللہ کی مرضی ہو اسی پر وہ راضی ہو۔ جو اللہ کا حکم ہو وہ اسے بسر و چشم بجا لائے اور اپنی زندگی کی غایت ہی یہ سمجھے کہ بس اپنے آقا‘ اپنے مالک‘ اپنے ربّ کو راضی کرنا ہے۔ اس کی رضا جوئی ہی اس کی زندگی کا مقصود ہو۔

ویسے تو لفظ ’’عبد‘‘ غلام کے معنی میں آتا ہے اور غلامی کے اندر ایک جبر کا مفہوم ہے۔ دنیا میں جب بھی کوئی کسی کا غلام ہوتا تھا یا اب بھی جو قومیں دوسری قوموں کی غلام ہوتی ہیں تو اِس غلامی میں جبر کا پہلو ہوتا ہے۔ یہ مجبوری اور مارے باندھے کی غلامی ہوتی ہے۔ کوئی اپنی مرضی سے کسی کا غلام نہیں بنتا‘ بلکہ دوسرا اُس پر مسلط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا لفظ ’’عبد‘‘ کے مفہوم میں چونکہ جبر کا پہلو شامل ہے اس لیے جب دین کے اندر اللہ کی عبادت کا تصور زیر بحث آئے گا تو یہ صراحت ضروری ہوگی کہ اس میں غلامی کا وہ عنصر تو بتمام و کمال موجود ہونا چاہیے کہ جیسے ایک غلام‘ ایک بندہ اپنے آقا کا مطیع فرمان ہوتا ہے‘ لیکن اس میں کوئی پہلو جبر کا نہ ہو‘ بلکہ اپنے آقا اور معبود کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنے آپ کو اس کے سامنے بچھا دیا جائے‘ اور اس کی بندگی اپنی آزاد مرضی سے اختیار کی جائے‘ جبر سے نہیں۔ گویا عبادت کے دو اجزاء ہیں‘ ایک ہے کُلّی اطاعت اور ایک ہے محبت کہ جو اِس اطاعت کی اصل روحِ باطنی ہے۔ ان دونوں

کے مابین باہمی نسبت وتناسب وہی ہے جو ہمارے اِس مادی وجود اور روحانی وجود کے مابین ہے۔ جیسے ہمارا جو جسمِ ظاہری ہے' نظر تو یہی آتا ہے' سارا وزن اسی کا ہے' لیکن اس میں جو اصل حقیقت ہے وہ جان ہے' روح ہے' اسی کی وجہ سے یہ قائم ہے' ورنہ تو یہ متعفن ڈھیر بن جائے گا' قریب ترین اعزہ واقارب بھی دُور بھاگیں گے۔ میں یہاں لفظ ''روح'' کو ''جان'' کے ہم معنی کے طور پر استعمال کر رہا ہوں' جو غلط العام تصور ہے۔ اِس وقت ''روح'' اور ''جان'' کا فرق زیرِ بحث نہیں ہے۔ تو جیسے نگاہ میں آنے والا ہمارا یہ ظاہری وجود ہے' وزن اسی کا ہے' لیکن اس کی اصل قدر وقیمت اُس روحِ باطنی کی ہے جو اِس کے اندر سرایت کیے ہوئے ہے' بالکل اسی طرح عبادت کا اصل جسد تو اطاعت ہے' نظر تو یہی آئے گا کہ فلاں آدمی نے اللہ تعالیٰ کا حکم مانا' اس نے اللہ کے حکم کے مطابق نماز پڑھی' اس نے اللہ کے حکم کے مطابق روزہ رکھا' اس نے اللہ کے حکم کے مطابق فلاں چیز کو حلال جانا اور فلاں چیز کو حرام جانا' لیکن اگر اس میں محبت کا پہلو نہیں ہے تو پھر یہ عبادت ایک بے جان جسد ہے' جس میں کوئی روح نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے اس دَور میں اسے خوب واضح کیا ہے کہ ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!

اور: ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُت کدۂ تصورات

اگر عبادت کے اندر محبتِ خداوندی کی روح جاری وساری نہ ہو تو یہ اعمال محض رسم بن کر رہ جاتے ہیں۔ تو عبادت کے یہ دو اجزاء بہت اہم ہیں' ایک اطاعتِ کُلی اور دوسرا محبتِ خداوندی۔

عبادت کے ذیل میں تیسری چیز کچھ مراسمِ عبودیت ہیں جو اپنی بندگی کو ظاہر کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ انسان کا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ کسی کی تعظیم اور نیازمندی کے اظہار کے لیے وہ کچھ صورتیں اختیار کرتا ہے' مثلاً جس کی تعظیم مقصود ہو انسان دست بستہ اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ بادشاہوں کے سامنے سینہ تان کر نہیں بلکہ جھک کر کھڑا ہوا جاتا ہے۔ پھر جس کی مزید تعظیم مقصود ہو اُس کے سامنے رکوع کیا جاتا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر سجدہ کیا جاتا ہے۔ سورج کی تعظیم مقصود ہو تو لوگ سورج کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں' سربسجود ہو جاتے ہیں۔ تو یہ ظاہری اعمال کہ جس میں اس عبادت کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے' مراسمِ عبودیت کہلاتے ہیں۔

عبادت کے ذیل میں چوتھی بحث ''دعا'' ہے جو عبادت کا لبِّ لباب اور اصل خلاصہ ہے۔ کسی ہستی کو پکارا جاتا ہے اُسے مشکل کشا' حاجت روا' تکلیفوں کا دُور کرنے والا سمجھ کر۔ اسے قادرِ مطلق سمجھتے ہیں تب ہی تو اسے پکارتے ہیں! اسے سمیع وبصیر سمجھتے ہیں تب ہی تو اسے پکارتے ہیں! اسے سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری تکلیفیں رفع کر سکتا ہے تو اس سے استغاثہ کرتے ہیں' استدعا کرتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) ''دعا ہی اصل عبادت ہے''۔ ایک اور جگہ ارشادِ نبویؐ ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) ''عبادت کا جوہر دعا ہے''۔

عبادت کے ذیل میں پانچویں اور آخری بحث ہے خلوص واخلاص۔ کوئی عبادت اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہے جب تک کہ اُس میں خلوص اور اخلاص نہ ہو۔ خلوص اور اخلاص کی ضد ہے ریاکاری' یعنی محض لوگوں کو دکھانے کے لیے کوئی عمل کرنا۔ اسی کے ساتھ ایک لفظ آتا ہے ''سُمعَہ''۔ یعنی محض لوگوں کو سنانے کے لیے کوئی عمل انجام دینا۔ ''ریا'' ہے دکھانا اور ''سُمعَہ'' ہے سنانا۔ تو عبادت میں جب ریا اور سُمعہ آ جائیں گے تو وہ عبادت قبول نہیں ہوگی' اس لیے کہ خلوص واخلاص جو قبولیت کی اصل شرط ہے' وہ مفقود ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کو بھی واضح کیا گیا: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ ......﴾ (البیّنۃ:٥) ''اور انہیں تو حکم بس یہی ہوا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین (غلامی اور اطاعت) کو اُس کے لیے خالص کرتے ہوئے' یک سو ہو کر۔'' اگر عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو بھی کچھ دکھانے اور سنانے کا عنصر شامل ہو گیا' لوگوں سے اپنی تعریف کرانا یا کوئی اور دُنیوی منفعت حاصل کرنا مقصد کے طور پر پیشِ نظر ہوا تو گویا خلوص اور اخلاص ختم ہوا اور عبادت میں ریا اور سُمعہ شامل ہو گئے اور اللہ کے ہاں ایسی عبادت مردود شمار ہوگی۔ تو عبادت کے یہ پانچ پہلو یا پانچ اجزاء ذہن میں متعین کر لیجیے۔ یعنی: (۱) اطاعت (۲) محبت (۳) مراسمِ عبودیت (۴) دعا' جو عبادت کا جوہر ہے' اور (۵) خلوص واخلاص' جو قبولیتِ عبادت کی شرط ہے' اور اس کی ضد ہے ریا اور سُمعہ۔

اب ہم اِن پانچ عنوانات کے تحت یہ سمجھیں گے کہ ''شرک فی العبادت'' ہے کیا! اس میں کچھ اشکالات آپ کے ذہنوں میں لامحالہ آئیں گے۔ چونکہ یہ مضامین عام طور پر سامنے نہیں آتے' ہم نے محض چند چیزوں کو متعین کر رکھا ہے کہ بس شرک یہی ہے اور اس شرک کی ہمہ گیری اور اس کی وسعت اکثر وبیشتر ہمارے سامنے نہیں ہے' لہٰذا جب یہ باتیں سامنے آتی ہیں تو بہرحال انسان چونکتا ہے۔ اور اس حوالے سے ایک سوال جو قدم قدم پر سامنے آئے گا وہ یہ ہے کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہر گناہ شرک ہے! لیکن ابھی ذرا اس اشکال' یا اس سوال یا اس اشتباہ کو ایک طرف رکھیے! میں اِن شاء اللہ آخر میں پوری وضاحت کے ساتھ اس کا جواب دوں گا۔ ابھی میں جو باتیں کہہ رہا ہوں پہلے ذرا اِن کے دلائل پر توجہ کرتے ہوئے اور ان کے face value پر ان کو سمجھئے کہ وہ صحیح ہیں یا نہیں' دل کو لگتی ہیں یا نہیں۔ میں اِن شاء اللہ الجبرا کے فارمولوں کے طریقے پر یہ باتیں آپ کے سامنے رکھوں گا۔

شرک فی الاطاعت

سب سے پہلی چیز اطاعت ہے۔ اب دیکھئے کہ ''شرک فی الاطاعت'' کیا ہے؟ اطاعت کا مفہوم وسیع ہے۔ اطاعت اللہ کی بھی ہے' اطاعت اس کے رسول ﷺ کی بھی ہے اور اطاعت اولوالامر کی بھی ہے۔ اولوالامر کوئی ایک ہی شخص نہیں ہوتا' بلکہ مسجد میں جو امام یا خطیب ہے وہ وہاں کا والیٔ امر ہے۔ کسی بستی کے اندر جو ذمہ دار فرد ہے وہ وہاں کا والیٔ امر ہے۔ کسی صوبے کا جو گورنر ہے وہ والیٔ امر ہے۔ آپ کا جو سربراہِ ریاست ہے وہ والیٔ امر ہے۔ اور نمعلوم کتنے والیانِ امر موجود ہیں۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ)) ''تم میں سے ہر ایک کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی''۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک عورت کو اپنے شوہر کے گھر پر اس کے مال اور اولاد پر اختیار حاصل ہوتا ہے' لہٰذا اُس سے اس کے بارے میں پُرسش ہوگی۔ اولاد اپنی والدہ کی اطاعت کرتی ہے' اس کا کہنا مانتی ہے۔ اب وہ اپنی اولاد کو اللہ کی اطاعت کی طرف لے گئی ہے یا اللہ کی معصیت کی طرف' اس سے اس بارے میں باز پرس ہوگی۔ اسی طرح ایک شخص جو خاندان کا سربراہ ہے' وہ اپنے گھر میں والیٔ امر ہے۔ اُس سے بیوی بچوں کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ وہ انہیں اللہ کی بندگی کی طرف لے گیا ہے یا اللہ کی معصیت اور بغاوت کی طرف۔ تو ہر ہر شخص اپنی اپنی سطح پر والیٔ امر ہے' ہر ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے۔ تو اب اس اطاعت میں اصول کیا ہوگا؟ یعنی بڑوں کی اطاعت' والدین کی اطاعت' اساتذہ کی اطاعت' علماء کی اطاعت' مرشدین کی اطاعت' حکمرانوں کی اطاعت وغیرہ میں ''توحید فی الاطاعت'' کیا ہے اور ''شرک فی الاطاعت'' کیا ہے؟ اسے نبی اکرم ﷺ کی احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں سمجھئے۔ اس ضمن میں ہمیں یہ اصول دے دیا گیا ہے کہ:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ))

''کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی اس معاملے میں جس میں خالق کی معصیت لازم آ رہی ہو''

مخلوق کی اطاعت کا انکار نہیں ہے' والدین کی اطاعت کرو' بڑوں کی اطاعت کرو' سپیریئرز کی اطاعت کرو' حکام کی اطاعت کرو' اساتذہ کی اطاعت کرو' اگر دینی اعتبار سے کسی کے ساتھ اپنے آپ کو منسلک کیا ہے تو اس کی اطاعت کرو' لیکن کسی کی اطاعت اللہ کی معصیت میں نہیں ہوگی' کوئی بھی اگر تمہیں اللہ کے حکم کے خلاف حکم دے گا تو اب اُس کی اطاعت نہیں ہوگی۔ وہاں ان کی اطاعت کا دائرہ ختم ہو جائے گا۔ اب ان کی معصیت لازماً کی جائے گی اور اللہ کی معصیت ہرگز نہیں کی جائے گی۔ لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت سپریم ہے' باقی تمام اطاعتیں اُس کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر ہیں تو یہ ''توحید فی الاطاعت'' ہے۔ اور اگر کسی ایک اطاعت کو بھی اس دائرے سے باہر نکال کر اللہ کی اطاعت کے ہم پلہ کر لیا گیا تو یہ شرک ہے۔ اور اگر اللہ کی اطاعت سے اوپر لے گئے تو یہ شرک سے بھی زیادہ گھناؤنی بات ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ ہر شخص کا دل اس کی گواہی دے گا اور عقلِ عام اسے تسلیم کرے گی۔

اب ذرا اِس فارمولے کو apply کیجیے اور یہ انتہائی کٹھن مرحلہ ہے۔ اس کے لیے میں ایک مثال خالص انفرادی سطح پر دوں گا اور ایک مثال اجتماعیت کی بلند ترین چوٹی کی دوں گا۔ اور ان دو کے مابین جو مدارج و مراتب ہیں' جو خلا ہے اس کو خود پُر کر لیجیے! اب خالص انفرادی سطح پر دیکھئے کہ میرا ایک نفس ہے جو مجھے اللہ کے حکم کے خلاف حکم دیتا ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْۗءِ ......﴾ (یوسف: ۵۳)

''اور میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتا' یقیناً نفس تو برائی پر اکساتا ہی ہے''۔

اب اصل مسئلہ میرے لیے ہے' اور وہ یہ کہ ایک طرف اللہ کا حکم ہے اور ایک طرف میرے نفس کا حکم ہے۔ ایک مرضی میرے مولیٰ کی ہے اور ایک خواہش میرے نفس کی ہے۔ میں چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ گیا ہوں۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے:

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش!

کہ تو نے مجھے ایک تختے پر باندھ کر سمندر کے اندر پھینک دیا ہے' اور تو چاہتا مجھ سے یہ ہے کہ میرا دامن تر نہ ہونے پائے۔ تو انسان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان ہے۔ ایک طرف اس کے ساتھ وہ نفس لگا ہوا ہے جس کے بارے میں خود قرآن یہ کہہ رہا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْۗءِ﴾ اور ساتھ ہی یہ کہا جاتا ہے کہ ع ''ہشدار کہ راہ بردم تیغ است قدم را'' کہ ہوشیار رہو' کہیں تمہارا قدم معصیت کی کسی دلدل کے اندر پھنس نہ جائے! نفس کے ساتھ یہ کشمکش ہر روز' ہر ساعت اور ہر آن ہے۔ فرض کیجیے آپ نے اذان سن لی ہے اور آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ نماز کا بلاوا آ چکا ہے' میرے ربّ کا حکم یہ ہے کہ میں اُس کی بارگاہ میں حاضر ہو جاؤں' جبکہ دوسری طرف میرے نفس کا بھرپور تقاضا ہے کہ ابھی سوئے رہو' آرام کرو' یہ چھوڑو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا مطالبہ ہے' پہلا میرا تقاضائے استراحت پورا کرو۔ اب آپ سوچیے کہ آپ نے دو اطاعتوں میں سے کس کو مؤخر کیا اور کس کو مقدم کیا! کس کو اوپر کر دیا اور کس کو نیچے کر دیا! انسان نے کس چیز کو مقدم کرنا ہے اور کس چیز کو مؤخر کرنا ہے (مَا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ) یہ فیصلہ خود اسے کرنا ہے۔ اور یہی ہے وہ کٹھن مرحلہ جو انسان کو ہر لحظہ طے کرنا پڑتا ہے۔

علامہ اقبال نے کہا تھا: ؎

بُتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

شرک اور کس بلا کا نام ہے؟ شرک فی الاطاعت اگر کسی شے کا نام ہے تو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ یہاں نفس کو اللہ کے برابر کر دیا' بلکہ اُس سے بھی اوپر لے گئے۔ اللہ کا حکم تابع ہو گیا ہے نفس کی خواہش کے' اور یہی شرک ہے۔ اس کے لیے اگر کوئی سند چاہیے تو قرآن مجید میں دو جگہ یہ مضمون آیا ہے۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد ہے: ﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ﴾ (آیت ۴۳) ''(اے نبیؐ!) کیا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا الٰہ بنا لیا؟'' اور سورۃ الجاثیۃ میں ہے: ﴿اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (آیت ۲۳)۔ قرآن مجید اپنے مطالب ومفاہیم میں بہت واضح ہے' یہ کتابِ مبین ہے۔ اسلام میں داخلے کا نقطۂ آغاز یا بالفاظِ دیگر ''شاہدرہ'' کلمۂ طیبہ ہے: ''لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ''۔ اور مذکورہ بالا آیات میں بھی یہی لفظ ''اِلٰـهَ'' آیا ہے کہ: ﴿اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ﴾ ''تو (اے نبیؐ!) کیا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا الٰہ بنایا ہوا ہے؟'' زبان سے تو کہہ رہا ہے ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' جبکہ اس کا اپنا نفس اور اپنی خواہش الٰہ بنی ہوئی ہے۔

ہم ایک بہت بڑے مغالطے میں مبتلا ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ الٰہ اور معبود بس وہی ہے جس کے آگے ہاتھ جوڑ کر آدمی کھڑا ہو' جس کے سامنے سجدہ کیا جا رہا ہو' جس کی ڈنڈوت کی جائے' کوئی چڑھاوا چڑھایا جائے۔ قبروں پر چڑھاوے چڑھائے جائیں تو ہماری رگِ توحیدی پھڑک اٹھتی ہے کہ یہ تو شرک اور کفر ہو رہا ہے! لیکن ہم اپنے نفس کے گلے میں جو ہار ڈالتے رہتے ہیں اور اپنے وجود کے اندر ہی اندر اپنے نفس کے آگے جو دست بستہ کھڑے رہتے ہیں یہ ہمیں نظر نہیں آتا' صرف اس لیے کہ یہ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے۔ لیکن اس سے دھوکہ نہ کھایئے' جیسے وہ بُت الٰہ اور معبود ہے جس کو سجدہ کیا جا رہا ہے ویسے ہی یہ نفس بھی الٰہ اور معبود ہے جس کی خواہش کو اللہ کی مرضی پر مقدم کیا جا رہا ہے۔ یہ نفس بھی مطالبہ کرتا ہے کہ مرضی میری چلے گی' میں نہیں جانتا اللہ کا حکم کیا ہے۔ بالکل وہی انداز ہے جیسے فرعون نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! میں نہیں جانتا اپنے سوا تمہارے لیے کوئی الٰہ۔ یہ تم کس کا نام لے رہے ہو؟ میں مالک ہوں مصر کا' یہاں پر میرا حکم چلے گا۔

مولانا روم جو ترجمانِ حقیقت ہیں' ان کا بڑا پیارا شعر ہے: ؎

نفسِ ما ہم کم تر از فرعون نیست
لیک اُو را عون ایں را عون نیست

یعنی میرا نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے۔ جو اُس نے کہا تھا وہی یہ نفس کہتا رہتا ہے کہ میں نہیں جانتا کسی اللہ کو' میں نہیں مانتا اس کے حلال اور حرام کو' میں نہیں تسلیم کرتا اس کے کسی حکم کو' بلکہ مرضی میری چلے گی اور تمہیں ماننی پڑے گی' تمہیں میرے حکم کے سامنے سر جھکانا ہوگا۔ بس زبان سے میں یہ بات اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس فوج نہیں' لاؤلشکر نہیں' جبکہ فرعون کے پاس لاؤلشکر تھا' اس کے پاس بہت بڑا تختِ حکومت تھا' لہٰذا اُس نے زبان سے بھی کہہ دیا تھا: ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾﴾ (النّٰزعٰت) ''میں ہی تمہارا ربِّ اعلیٰ ہوں''۔

تمام نقلی اور عقلی دلائل سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ رہی ہے کہ تمام اطاعتیں اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تابع ہو جائیں' کوئی اطاعت اللہ کی اطاعت کے ہم پلہ نہ ہو' اس سے بالاتر نہ ہو تو یہ ''توحید فی الاطاعت'' ہے۔ اور اس کے برعکس جہاں بھی کوئی اطاعت اللہ کی اطاعت کے مساوی ہو گئی' یا اس سے بھی بالا ہو گئی' تو یہ ''شرک فی الاطاعت'' ہے۔

''شرک فی الاطاعت'' کی اجتماعی صورتیں

اب ذرا اجتماعی سطح پر دیکھئے! اجتماعیاتِ انسانیہ کی بلند ترین سطح ریاست کا تصور ہے' اور یہ تصور حال ہی میں سامنے آیا ہے۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں حکومت کا تصور تھا' ریاست کا نہیں تھا۔ ریاست تو ایک فرضی (hypothetical) ادارہ تھی' ایک مجرد سی اس کی حیثیت تھی۔ جبکہ حالیہ تصور یہ ہے کہ حکومت اور چیز ہے ریاست اور چیز ہے' اور حکومت کی حیثیت ریاست کو چلانے والی مشینری کی ہے۔ ریاست میں سب سے پہلی چیز جو طے ہوتی ہے وہ حاکمیت کا اصول ہے کہ اس ریاست میں حاکمیت کس کی تسلیم کی جا رہی ہے' آخری اختیار کس کے پاس ہے' قانون سازی کا آخری حق کس کے ہاتھ میں ہے؟ اب اس اجتماعی سطح پر توحید یہ ہے کہ: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ ''حکم صرف اللہ کے لیے ہے''۔ حاکمیت کا اختیار سوائے اللہ کے کسی کے لیے نہیں۔ اس نظریے کی جہاں بھی نفی ہوگی وہ شرک ہے۔ آپ نے حاکمیت کسی اور کے لیے تسلیم کی تو شرک ہو گیا۔ بقول اقبال: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آزری

حقائقِ قرآنی کی ترجمانی میں ایک وقت میں جو مقام و مرتبہ مولانا روم کا تھا اِس زمانے میں وہی مقام و مرتبہ علامہ محمد اقبال کا ہے۔ اگرچہ علامہ اقبال کو مولانا روم سے کوئی شخصی نسبت نہیں ہے' اس لیے کہ وہ نہ صرف اپنے فکر میں بہت بلند تھے' بلکہ اپنے عمل میں بھی بہت بلند تھے' جبکہ علامہ اقبال کا عمل کا پہلو بہت کمزور ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو معاف فرمائے' ان کی فروگزاشتوں سے درگزر فرمائے! لیکن فکر کے اعتبار سے واقعتاً دونوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ جس سطح پر مولانا روم تھے اسی سطح پر اِس دَور میں علامہ اقبال ہیں۔ اور انہوں نے کس خوبصورتی سے حاکمیت کے تصور کو بیان کیا ہے! اقبال بار بار کہتے ہیں کہ میں شاعر ہوں ہی نہیں' میں تو شاعری کو صرف ایک ذریعے کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔ ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

آپ دیکھئے یہ کوئی شاعری تو نہیں ہے۔ شاعری تو گل و بلبل کی شاعری ہوتی ہے' کاکل و رخسار اور زلفِ پیچاں کی شاعری ہوتی ہے۔ جبکہ یہاں شاعری ہو رہی ہے: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آزری

تو حاکمیتِ اعلیٰ کے اس اصول کو آپ جہاں توڑ دیں گے وہاں شرک ہو جائے گا۔ انسانی حاکمیت (human sovereignty) ہر حال میں شرک ہے' چاہے وہ بادشاہت اور ملوکیت (monarchy) ہو' چاہے جمہوریت (democracy) ہو اور چاہے مذہبی حکومت (theocracy) ہو۔ اگر کوئی فردِ واحد بیٹھا ہے کہ حاکم میں ہوں' میرے ہاتھ میں قانون سازی کا اختیار ہے' میری زبان سے نکلا ہوا لفظ قانون ہے' تو یہ بدترین شرک ہے۔ یہ تو ﴿اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾ کی نفی ہو گئی! اسی طرح عوامی حاکمیت (popular sovereignty) بھی بدترین شرک ہے کہ جمہور اختیار کے مدعی بن کر سامنے آ جائیں کہ حاکمیت ہماری ہے۔ اس دَور کا سب سے بڑا اور سب سے عام شرک یہی ہے۔ بُت پرستی والے شرک کا دَور گزر گیا ہے۔ اب ہندوستان میں بھی شاید ایک دو فیصد لوگ ہی ہوں جو بُتوں کی ڈنڈوَت کرتے ہوں' اب جو شرک ہیں وہ بالکل دوسرے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر دَور میں شرک جو بھی نیا لبادہ اوڑھ کر آتا ہے اس کو انسان سمجھے۔ بقولِ اقبال: ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

جب آدمی کو ذرا شعور حاصل ہوا تو اُس نے فردِ واحد کی حکومت کو ماننے سے انکار کر دیا اور عوامی حاکمیت کو تسلیم کر لیا۔ حالانکہ دینی اعتبار سے بات وہی ہے' وہ بھی شرک ہے اور یہ بھی شرک ہے۔

اسی طرح مذہبی حکومت یا پاپائیت (theocracy) کا نظریہ بھی شرک ہے' جس میں کوئی مذہبی طبقہ اپنے ہاتھ میں اختیار لے کر بیٹھ جاتا ہے کہ وہ جو چاہے قانون بنا دے۔ یورپ میں جو پاپائیت کا نظام رائج رہا ہے وہ بدترین شرک ہے۔ قرآن مجید نے اس پر بہت بڑی فردِ جرم عائد کی ہے کہ: ﴿اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ: ۳۱) ''انہوں نے اپنے علماء اور صوفیوں کو اللہ کے علاوہ اَرباب بنا لیا ہے''۔ یعنی ان کو معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ حاتم طائی کے بیٹے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ عیسائیت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے' اس آیت کے بارے میں انہوں نے بڑے ادب سے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی کہ حضور ﷺ! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی' میں عیسائی رہا ہوں اور ہم نے اپنے احبار اور رُہبان کو خدا نہیں بنایا۔ یہ ایک بہت بڑا اشتباہ تھا کہ قرآن مجید عیسائیت پر اتنا بڑا چارج لگا رہا ہے۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَمَا اِنَّهُمْ لَمْ یَكُوْنُوْا یَعْبُدُوْنَهُمْ وَلٰكِنَّهُمْ كَانُوْا اِذَا اَحَلُّوْا لَهُمْ شَیْئًا اسْتَحَلُّوْهُ وَاِذَا حَرَّمُوْا عَلَیْهِمْ شَیْئًا حَرَّمُوْهُ))

''کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ (عیسائی) ان (اَحبار و رُہبان) کی بندگی تو نہیں کرتے تھے مگر وہ ان کے لیے جب کوئی چیز حلال ٹھہراتے تو وہ اسے حلال سمجھ بیٹھتے تھے اور وہ ان پر جب کوئی چیز حرام قرار دیتے تو وہ اُسے حرام سمجھ بیٹھتے تھے؟''

اس لیے کہ شریعتِ موسوی تو ختم ہو گئی تھی' اب قانون کا حق پوپ کے ہاتھ میں اور اس کے نمائندوں کے ہاتھ میں تھا کہ پوپ جس چیز کو چاہے حلال ٹھہرا دیں اور جس چیز کو چاہے حرام ٹھہرا دیں۔ تو جس کے ہاتھ میں یہ اختیار آ گیا وہی تو خدا ہے۔ لہٰذا بادشاہت و ملوکیت' مذہبی حاکمیت اور جمہوریت تینوں ہی شرک کی شکلیں ہیں۔

آج جمہوریت اور عوام کی حاکمیت کا دَور ہے۔ اور جیسے بادشاہ کی حاکمیت اور مذہبی راہنما یا مذہبی طبقہ کی حاکمیت شرک ہے اسی طرح یہ بھی اجتماعی سطح پر شرک ہے۔ ہاں اگر بادشاہ خود بھی اللہ کے قانون کا پابند ہو' اور اللہ ہی کے قانون کو نافذ کر رہا ہو تو یہ شرک نہیں ہے۔ حضراتِ داوٗد اور سلیمان علیہما السلام یقیناً شرک کرنے والے نہیں تھے' جبکہ نمرود اور فرعون شرک کرنے والے تھے۔ اسی طرح مذہبی طبقہ اگر اپنی مرضی سے نہیں بلکہ قرآن مجید (یا اپنے اپنے دَور میں تورات' انجیل' زبور) کے مطابق حکم دے رہا ہو اور اس کے ہاتھ میں انتظامی اختیارات ہوں تو

یہ شرک نہیں ہوگا۔ بخدائی حاکمیت کے تصور کے تحت ایک مذہبی حکومت ہو جائے گی کہ اختیارِ مطلق اللہ کا ہے‘ لیکن انتظامی امور مذہبی طبقے کے ہاتھ میں ہیں۔ حضرت طالوت سے پہلے پہلے بنی اسرائیل میں جو نظام رہا ہے وہ اسی نوعیت کا نظام تھا۔ حدیثِ مبارکہ ہے کہ:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ))

''بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کرتے تھے''۔

چنانچہ ایک جمہوریت اگر یہ طے کر لے کہ اصل تشریع کا حق اللہ کا ہے اور جو بھی پارلیمنٹ یا کانگریس ہے اس کے اختیارات کتاب و سنت کے دائرے کے اندر اندر محدود ہیں تو وہ جمہوریت اب شرک نہیں ہوگی‘ لیکن مطلق جمہوریت‘ مطلق بادشاہت و ملوکیت‘ مطلق تھیوکریسی شرک ہے۔ تو ابتدا سے لے کر انتہا تک اصول یہی ہے کہ مطلق اطاعت صرف اللہ کا حق ہے‘ باقی سب کی اطاعت مشروط ہوگی اللہ کی اطاعت سے۔ یہ ہے ''توحید فی الاطاعت'' اور اس کو جہاں بھی مجروح کر دیا جائے گا وہ شرک کی کوئی شکل بن جائے گی‘ چاہے وہ خالص انفرادی سطح پر نفس پرستی ہو یا اجتماعی سطح پر حاکمیتِ غیر اللہ کا کوئی بھی تصور ہو۔ اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت کا تصور بہر طور شرک ہو جائے گا۔

شرک فی المحبت

عبادت میں دوسری لازمی چیز ''محبت'' ہے۔ اب دیکھئے ''شرک فی المحبت'' کیا ہے اور ''توحید فی المحبت'' کیا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ کا بیسواں رکوع اس موضوع پر کلائمکس ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ﴾(البقرۃ:١٦٥)

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا کچھ ہستیوں کو (اس کے) مدّ مقابل بنا لیتے ہیں‘ وہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے محبت ہونی چاہیے''۔

یہاں ''شرک فی المحبت'' کا ذکر بھی آ گیا ہے اور ''توحید فی المحبت'' کا بیان بھی ہو گیا ہے۔ یعنی اگر کوئی ہستی یا کوئی ادارہ اتنا محبوب ہو جائے جتنا اللہ محبوب ہے‘ تو یہ ''شرک فی المحبت'' ہے۔ اسی طرح محبت کے اندر توحید کیا ہے؟ فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ ''اور جو لوگ واقعتاً ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ سخت ہیں اللہ کی محبت میں''۔ یعنی ان کی ساری محبتوں پر غالب محبت اللہ کی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل امتحان ہی محبت کا امتحان تھا اور آپؑ سارے امتحانات میں پاس ہو گئے تھے۔ والدین کی محبت کو انہوں نے اللہ کی محبت پر قربان کر دیا اور توحید کی خاطر والدین کے گھر کو چھوڑ دیا۔ اپنی قوم کی محبت کو اللہ کی محبت پر قربان کر دیا۔ وطن کو چھوڑ کر وطن کی محبت کو اللہ کی محبت پر قربان کر دیا۔ جیسے انہوں نے فرمایا تھا:

﴿اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿٩٩﴾﴾ (الصّٰفّٰت)

''یقیناً میں تو اب اپنے ربّ کی طرف جا رہا ہوں‘ عنقریب وہ مجھے راہ یاب کر دے گا''۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آخری آزمائش بیٹے کی محبت کی تھی۔ اور بیٹا بھی اکلوتا‘ جو ستاسی برس کی عمر میں دعائیں مانگ مانگ کر ملا‘ اور انتہائی حلیم الطبع بیٹا‘ جس کے رُوئیں رُوئیں سے سعادت مندی اور نیکی پھوٹ رہی تھی۔ ذرا اندازہ کیجیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں اُس کے لیے کتنی محبت ہوگی! اب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آخری امتحان لیا کہ بیٹے کی محبت کہیں ہماری محبت سے بالاتر تو نہیں ہو گئی؟ ابراہیم! اسے بھی اگر تم ہمارے لیے‘ ہمارے حکم کے تحت ذبح کر سکتے ہو تب تو واقعتاً تم موحّد فی المحبت ہو گئے‘ اللہ کی محبت میں توحید کا مقام تم نے حاصل کر لیا‘ اور اگر یہاں ناکام ہو گئے تو جان لو کہ توحید کے امتحان میں ناکام ہو گئے۔ پھر تو معلوم ہوا کہ ایک محبت ابھی ایسی ہے جو دل کے سنگھاسن پر اللہ کی محبت کے برابر بیٹھی ہے یا اس سے بھی بالاتر ہو گئی ہے۔ یہ آخری امتحان تھا محبت کا‘ جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سرخرو ہو گئے ــــــ اور یہ ہے ''توحید فی المحبت''۔

''شرک فی المحبت'' کی دلیل کے لیے بھی دو آیات پیش کی جا رہی ہیں۔ ایک تو وہ آیت جس کا ہم نے ابھی مطالعہ کیا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ﴾(البقرۃ:١٦٥)

''اور لوگوں میں کچھ وہ بھی ہیں جو اللہ کے سوا کچھ ہستیوں کو (اس کے) مدّ مقابل بنا کر اُن سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے محبت کرنی چاہیے''۔

دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾﴾ (التوبۃ)

’’(اے نبیؐ ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں اپنے باپ‘ اپنے بیٹے‘ اپنے بھائی‘ اپنی بیویاں‘ اپنے رشتہ دار اور اپنے وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے جمع کیے ہیں اور اپنے وہ کاروبار جن کی کساد بازاری کا تمہیں خوف رہتا ہے اور اپنے وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں (جنہیں تم نے بہت شوق اور ارمانوں سے بنایا ہے) زیادہ محبوب ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو جاؤ انتظار کرو (دفع ہو جاؤ) یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سامنے لے آئے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

اس لیے کہ یہ مشرک ہیں‘ یہ ’’شرک فی المحبت‘‘ کے اندر مبتلا ہیں۔ انہیں یہ آٹھ چیزیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں۔

اب ذرا اس اصول کو الجبرا کے فارمولے کی طرح عملی زندگی میں apply کیجیے! قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ج﴾ (النساء:۱۳۵)

’’اے اہل ایمان! انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ وہ (انصاف کی بات اور گواہی) تمہارے اپنے خلاف یا والدین اور رشتہ داروں کے خلاف جاتی ہو‘‘۔

آپ اپنے گروہی اور فرقہ وارانہ تصورات لیے بیٹھے ہیں‘ ان پر ذرا سی آنچ آتی ہے تو آپ تلملا اٹھتے ہیں۔ اگر آپ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ شرک سے بچے ہوئے آپ بھی نہیں ہیں تو بہر حال غصہ تو آئے گا۔ لیکن ذرا غور تو کیجیے اور حقیقت کو سمجھئے‘ دوسروں پر شرک کے فتوے جڑ دینا آسان ہے‘ دوسرے کی آنکھ کے اندر تنکا بھی نظر آ جاتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید سے سمجھئے کہ ’’شرک فی المحبت‘‘ کیا ہے۔

مال سے انسان کو بہت محبت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے۔ اسے آپؐ کی بددعا بھی کہا جا سکتا ہے اور خبریہ کلام بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ)) ’’ہلاک ہو جائے (یا ہلاک ہوا) درہم و دینار کا بندہ۔‘‘

دیکھئے نبی اکرم ﷺ نے یہاں ’’عبد‘‘ کا لفظ استعمال کیا ہے‘ جیسے سورۃ الفرقان کی آیت ۴۳ اور الجاثیۃ کی آیت ۲۳ میں ’’الٰہ‘‘ کا لفظ لایا گیا ہے‘ تاکہ کوئی اشکال اور اشتباہ باقی نہ رہے‘ اِدھر اُدھر سے بچ نکلنے کا کوئی موقع نہ رہے۔ جسے مال بہت محبوب ہے اسے آپؐ نے عبدالدرہم اور عبدالدینار کہا ہے۔ اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ بس مال آنا چاہیے‘ چاہے حلال سے آئے یا حرام سے آئے۔ اب اگر آپ کے دل میں مال کی محبت اِس قدر ہے تو آپ کا محبوب اور معبود مال ہوا۔ اس لیے کہ جو چیز محبوب ہے وہی معبود ہے۔ اب آپ کے معبود دو ہو گئے۔ آپ اللہ کے لیے بھی سجدے کرتے ہیں اور مال بھی آپ کا معبود ہے‘ اگرچہ آپ لکشمی دیوی کو نہیں پوجتے‘ خود اس کے پجاری بھی اس لکشمی کو نہیں پوجتے‘ بلکہ دولت کو پوجتے ہیں‘ لکشمی تو درحقیقت اُن کے ہاں ایک علامت ہے‘ پجاری تو اصل میں وہ دولت کے ہیں۔ اسی طرح ہم نے بھی اگرچہ لکشمی کو دیوی قرار دے کر اس کی مورتی نہیں بنائی لیکن اس کی پوجا کا جو اصل مقصود ہے وہ تو ہم کر رہے ہیں۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’ہلاک ہو گیا (یا ہلاک ہو جائے) درہم و دینار کا بندہ‘‘۔ اب چاہے اس نے اپنا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن رکھا ہو لیکن اس کی اصل اور معنوی شخصیت عبدالدینار اور عبدالدرہم کی ہے۔ یہ خالص انفرادی سطح کی بات ہے اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ یہ بات فرما رہے ہیں۔

اجتماعی سطح پر ’’شرک فی المحبت‘‘ کی صورت

اجتماعی سطح پر دیکھئے کہ ’’توحید فی المحبت‘‘ کیا ہے اور ’’شرک فی المحبت‘‘ کیا ہے۔ اس دَور کے جو اجتماعی تصورات ہیں ان میں ایک تصور وطن کی بنیاد پر قوم پرستی (nationalism) کا ہے۔ پچھلے زمانے کی قوم پرستی اکثر و بیشتر نسل کی بنیاد پر ہوتی تھی اور جو تصادم ہوتا تھا وہ بھی نسلی بنیاد پر ہوتا تھا‘ جبکہ انیسویں اور بیسویں صدی کا جو سب سے بڑا سیاسی تصور یورپ نے دیا ہے وہ وطنی قوم پرستی کا تصور ہے کہ ایک وطن کے اندر رہنے والے سب ایک قوم ہیں اور مذہب ہر ایک کا ذاتی مسئلہ ہے‘ چاہے کوئی ہندو ہو‘ سکھ ہو‘ پارسی ہو‘ عیسائی ہو‘ اس سے حکومت کو بحث نہیں ہے۔ ریاست سیکولر ہے‘ ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں جو بھی اس حدود کے اندر رہنے والے ہیں ان کو قومیت (nationality) مل جائے گی کہ وہ اس وطن کے رہنے والے ہیں اور اس ریاست کے شہری ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ ہر اجتماعیت کو لازماً کوئی چیز ایسی چاہیے جو مرکزِ محبت بن جائے۔ اس لیے کہ اگر کسی چیز کے ساتھ جذباتی لگاؤ نہیں ہوگا تو اس کے ساتھ کیسے جڑیں گے‘ کیسے بنیانِ مرصوص بنیں گے‘ خطرات کا مقابلہ کیسے کریں گے؟ لہٰذا اِس دَور میں جو اصل معبود تراشا گیا ہے وہ وطن ہے۔ وطن کی محبت اور عظمت کے گن گائے جاتے ہیں‘ وطن کی آن پر کٹ مرنے کا درس دیا جاتا ہے‘ وطن کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ وطن کے جھنڈے کے سامنے باادب کھڑے ہو کر اسے سلامی دی جاتی ہے۔ وطن کا ایک ترانۂ حمد بھی ہوتا ہے جس کو قومی ترانہ کہا جاتا ہے۔ یہ مذہبِ وطنیت ہے جس کے یہ مراسمِ عبودیت ہیں۔ یہ اِس دَور کا نیا شرک ہے اور اس کو ہمارے علماء میں سے کوئی نہیں سمجھ پایا۔ میں علامہ اقبال کی عظمتِ فکر کا اسی لیے قائل ہوں کہ اِس حقیقت کو سمجھنے والے اِس دَور میں صرف علامہ اقبال تھے۔ جس طرح انہوں نے حاکمیتِ اعلیٰ کے نظریے کو واضح کیا ہے‘ اسی طرح انہوں نے ’’وطنیت‘‘ کے بُت پر کاری ضرب لگائی ہے۔ ملاحظہ ہو: ؎

اِس دَور میں مے اور ہے ‘ جام اور ہے ‘ جم اور
ساقی نے بِنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال کے جذبے اور احساس کی شدت کا عالم دیکھئے! اس لیے کہ اُن کا مشاہدہ بہت گہرا تھا' انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ کتنا پانی دریائے راوی کے پل کے نیچے سے گزر چکا ہے۔ اب لات' منات' عزیٰ اور ہبل کی پوجا کا زمانہ گزر چکا ہے' اِن بُتوں کے پجاری آج نہیں ملیں گے' آج پوجا کسی اور شے کی ہو رہی ہے' اور اس جگہ پر سب سے بڑا بُت وطن ہے۔ اب ہمارے ہاں بھی یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ ہم نے اِن چیزوں کی حقیقت پر غور نہیں کیا۔ یہ جھنڈے کی سلامی چہ معنی دارد؟ یہ دراصل وطن کے مراسمِ عبودیت میں سے ہے کہ جب قومی ترانہ گایا جا رہا ہو تو آپ جھنڈے کے سامنے ساکت وصامت کھڑے ہو جائیں۔ یہ گویا وطن کی نماز ہے جو پڑھی جا رہی ہے اور ہم نے اسے سمجھا نہیں ہے۔ ہر مذہب میں اپنے معبود کے ساتھ محبت کے اظہار اور اُس کی عظمت کے اقرار کے لیے کچھ شکلیں اختیار کی جاتی ہیں' اسی طرح وطن کی محبت کے اظہار اور اس کی عظمت کے اقرار کے لیے اس کے جھنڈے کو عاجزی کے ساتھ سلامی دی جاتی ہے۔ یہ مذہبِ وطنیت جو یورپ کا ایجاد کردہ تھا' اس کی تمام مذہبی رسومات (rituals) کو ہم نے جوں کا توں قبول کر لیا ہے۔ یہ اُس مذہب کی رسومات ہیں جس کا معبود وطن ہے۔ اس کے بارے میں اقبال نے مزید کہا:

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفوی خاک میں اِس بُت کو ملا دے!

وطن کے اس بُت کو خاک میں ملا دینا علامہ اقبال کا پیغام ہے۔ دیکھئے وطن آپ کا معبود کیسے ہوا؟ اس لیے کہ آپ کی محبت کا مرکز وطن بن گیا ہے۔ اب آپ کے نزدیک جو سے وطن کے لیے اچھی ہے وہ اچھی ہے' چاہے فی نفسہ وہ جائز ہو یا ناجائز ہو۔ وطن کے لیے آپ کو دوسروں پر ظلم کرنا پڑ رہا ہے تو آپ کر رہے ہیں۔ اپنے وطن کی جے بولی جا رہی ہے۔ کبھی اعلیٰ ہبل کے نعرے لگا کرتے تھے' لیکن اب وطن کے نعرے ہیں۔ اس زمین نے درحقیقت آج دیوتا کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس کی بنیاد پر قومیت کا تصور ہے جو آج کے اجتماعی تصورات میں اہم ترین تصور ہے۔

بہرحال ''توحید فی المحبت'' یہ ہے کہ محبت کا اصل مرکز ذاتِ باری تعالیٰ ہو' تمام محبتیں اس کے تابع ہو جائیں ــــــ اور ''شرک فی المحبت'' یہ ہے کہ کسی شخص یا کسی ادارے یا کسی شے کی محبت اللہ کی محبت کے ہم پلہ ہو جائے یا اس سے بالاتر ہو جائے۔